میثم قادری

گلہ جفائے وفا نما کہ اہل حرم کو حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم ہری ہری

تحریکِ پاکستان

اور

علمائے دیوبند

سید محمد فاروق القادری (ایم۔ اے)

انجمن غوثیہ اہل سنت و جماعت تربیلا ڈیم (ہزارہ)

بتعاون: دار العلوم اسلامیہ رحمانیہ رجسٹرڈ ہری پور ہزارہ

انجمن غوثیہ اہل سنّت وجماعت کے

اغراض و مقاصد

۱۔ مسلک اہل سنّت وجماعت کی اشاعت وحفاظت

۲۔ ہر ماہ ایک تبلیغی محفل منعقد کرنا۔

۳۔ اسلامی لائبریری کا قیام

۴۔ اسلامی تہواروں کو تزک واحتشام سے منانا

۵۔ صدقات، زکوٰۃ، فطرانہ، چرم ہائے قربانی کو اکٹھا کرنا اور مستحق افراد تک پہنچانا۔

۶۔ اکابرین اسلام کے یوم منانا اور ان کے کارہائے نمایاں سے عامۃ النّاس کو روشناس کرانا۔

۷۔ ناگہانی مصائب میں درجہ چہارم کے افراد کو فوری طور پر امداد مہیّا کرنا۔

۸۔ غیر شرعی امور کے خلاف نشر و اشاعت کرنا۔ اور

۹۔ اسلامی معاشرہ کے فروغ کے لئے جدوجہد کرنا۔

ناظم نشر واشاعت

انجمن غوثیہ اہل سنت وجماعت، تربیلا ڈیم پراجیکٹ، ضلع ہزارہ

پیش لفظ

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

امسال بچوں کے سالانہ امتحانات کے دوران درسی ادارہ "گجرات" کا مطبوعہ معاشرتی علوم کا ایک ٹیسٹ پیپر دیکھنے میں آیا۔ مطالعہ پاکستان کے عنوان سے صفحہ ۶ پر ایک سوال یوں شروع ہوتا ہے "علی گڑھ اور دیوبند[1] کی تعلیمی تحریکوں کا مقابلہ کیجیے اور ان کے باہمی تعلق کو بیان کیجیے" احساس ہوا کہ آخر اس تقابل کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور پھر ۱۹۴۷ء کے فسادات یک لخت یاد آ گئے (بندہ ان دنوں مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے ایک رضا کار کی حیثیت سے لاہور ریلوے اسٹیشن پر مہاجرین کی خدمت پر مامور تھا) اور وہ دردناک منظر تو آج تک نہیں بھول سکا جو اسٹیشن پر ریل گاڑی کے ایک ڈبہ میں نظر آیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مشرقی پنجاب سے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے والی مہاجرین کی ایک گاڑی کے ایک ڈبہ میں کسی معصوم بچے کا ہاتھ آویزاں تھا اور ساتھ ہی

---

[1] کانگریسی علماء جن کا تعلق "دیوبند" سے تھا۔ نظریہ پاکستان کے مخالف تھے۔ چنانچہ مفتی محمد شفیع صاحب سابق مفتی دیوبند (حال کراچی) اپنے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

"۳۵ء کے آخر میں یہ نوبت آگئی کہ سیاست کا عَلَم کانگریس کے ہاتھ میں تھا اور مسلمان اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ اب اس انداز کی سیاست دیوبند میں بھی در آئی تھی ...... دیوبند میں کانگریسی مزاج پختہ ہوتا چلا گیا۔" (ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" لاہور۔ جولائی ۱۹۶۸ء ص ۲۸)

"سابق صوبہ سرحد میں صورت حال بڑی نازک تھی .... علماء کا ایک گروہ جو دیوبند سے اُس زمانے میں فارغ التحصیل ہوا تھا جب وہاں (سرحد میں) کانگریسی سیاست غالب آچکی تھی، سرخ پوشوں کی حمایت میں کام کر رہا تھا ......" (ایضاً ص ۳۰)

خون سے یہ عبارت مرقوم تھی کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" اور خدا کے فضل و کرم سے پاکستان بن کے رہا اور دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی اسلامی مملکت کو ابھارنے کا غیر فانی کارنامہ مشائخ عظام اور امام احمد رضا[1] فاضل بریلوی کے شیدائیوں یعنی سواد اعظم کے مکمل تعاون سے قائد اعظم نے سرانجام دیا۔ قائد اعظم کو پنجاب میں یونی نسٹ پارٹی سے جسے ہندوؤں، سکھوں، احراریوں اور انگریز نوکرشاہی کی مکمل اور غیر مشروط حمایت حاصل تھی، لڑنا پڑا۔ انہیں صوبہ سرحد میں سرخپوشوں جیسی عوامی فعّال تحریک سے جسے برصغیر کے ہندو پریس اور کانگریس جیسی ہمہ گیر تحریک کی کھلی کھلی اعانت حاصل تھی ٹکر لینا پڑی۔ سندھ میں انہیں جی ایم سید اور ان کے طاقتور ہندو حلیفوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ یہ تو تھی ان کی اپنوں سے جنگ۔ بیرونی محاذ پر ان کا مقابلہ ایک طرف انڈین نیشنل کانگریس سے تھا جو گاندھی، نہرو، پٹیل جیسے بین الاقوامی طور پر شہرت یافتہ لیڈروں کی قیادت میں ایشیا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت متصور ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی اس سیاسی جماعت کو نہ صرف ٹاٹاؤں، برلاؤں، سارا بائیوں اور ڈالمیوں جیسے سرمایہ داروں کی حمایت حاصل تھی بلکہ "جمعیت العلمائے ہند" اور "دیوبند کے مقدسین" بھی اپنی مکمل فوج کے ساتھ کانگریس کے خیمہ برداروں میں شامل تھے اور ہنود کا حق نمک ادا کرنے کے لئے سوامی شردھانند جیسے کٹر متعصب ہندو کو دہلی کی جامع مسجد کے منبر رسول پر بٹھا کر اس سے تقریر کروائی اور دو قومی نظریہ کو باطل ثابت کرنے کی انتہائی مذموم حرکت کر ڈالی۔

اُن دنوں نیشنلسٹ علماء اپنا منہ چھپاتے تھے۔ احراری، دیوبندی اور کانگرسی ایک

[1] آپ کے خلیفہ اور جلیل القدر عالم مولانا نعیم الدین مُرادآبادی (م ۔ ۱۹۴۸ء) نے "آل انڈیا سُنّی کانفرنس" (جو ۱۹۲۵ء میں قائم ہو چکی تھی) کے پلیٹ فارم سے تحریک پاکستان کی راہ ہموار کی۔ اگر سواد اعظم کے رہنما علماء و مشائخ اس وقت "ہندو مسلم اتحاد" کے دلفریب اور گمراہ کن نعرہ کا اثر و نفوذ قبول کر لیتے یا انگریزی حکومت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے تو پھر اسلامی عصبیت کی بناء پر برصغیر کے مسلمانوں میں علیحدہ وطن حاصل کرنے کی تڑپ پیدا نہ ہوتی اور نہ ہی پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کا باطل شکن نعرہ برصغیر کی فضاؤں میں گونج سکتا۔

گالی تصور کی جاتی تھی۔ جامعہ علی گڑھ کے طلباء قائد اعظم کے سپاہی بن چکے تھے جب کہ دیوبند کے طلباء گاندھی کی تقاریر کے عربی تراجم کے ساتھ سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ کر رہے تھے اور قائد اعظم کی دشمنی کا حق ادا کرنے میں مصروف تھے۔ نوائے وقت نے نیشنلسٹ علماء کے بارے میں یوں لکھا "ہندوستان کی وحدت اور اکھنڈ بھارت کے حق میں ہندو کانگریس اور نیشنلسٹ علماء کا استدلال ہی وطنیت کے فلسفہ پر مبنی تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی (دیوبندی) نے تو عربی لغات اور عربی دانی کے حوالہ سے اس فلسفہ پر معرکتہ الآراء مقالے تحریر کئے تھے لیکن پاکستان کا قیام بذاتِ خود اس مکتبِ فکر کی موت تھی۔ ستائیس سال بعد آج پھر اس بحث کا آغاز کرنا ایک خطرناک بیماری کی علامت ہے[1]"۔

"تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس قسم کے دوسرے لوگ مثلاً ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی صدر جمعیت علماء ہند اپنے دور میں فن خطابت کے امام تھے۔ ہندو کانگریس نے ان کے فن خطابت ہی کی وجہ سے ان کو بھاری قیمت کے عوض خرید رکھا تھا۔ متحدہ ہندوستان میں جب کانگریس نے رابطۂ عوام کی ہمہ گیر مہم شروع کی تو سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام کے نام پر بے وقوف بنانے کے لئے انہیں حضرات کے فن خطابت کا استعمال کیا ہے۔ مسلمان سادہ لوح تھا۔ ان جادو بیان حضرات نے کافی عرصہ اپنے فسنوں سے مسلمانوں کو بے ہوش رکھا اور پھر طُرّہ یہ کہ ان حضرات نے نہایت ہی عالمانہ انداز میں ہندو کانگریس کے متحدہ قومیت کے نظریہ کو نہایت عیاری سے اسلامی رنگ دے کر مسلمانوں کو خوب بیوقوف بنایا اور اپنے کانگریسی آقاؤں سے خوب رو پہلی داد وصول کی مگر یہ طلسم کب تک چل سکتا تھا۔ قائد اعظم نے جب مطالبہ پاکستان اور دو قوموں کا نظریہ پیش کیا تو مسلمان چونک اٹھا۔ اور قائد اعظم کی آواز اس کے دل میں اتر گئی کیونکہ قائد اعظم کی آواز اسلام اور قرآن کی آواز تھی۔

[1] روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۱۹ جنوری ۱۹۷۵ء

ہندو کانگرس کے ان نقارچیوں نے بڑی شدومد کے ساتھ مطالبہ پاکستان اور دو قومی نظریہ کو غیر اسلامی اور قرآن کے احکامات کے خلاف قرار دینے کے لئے اپنے حسنِ خطابت کے زور پر مسلسل طوفان بدتمیزی پیدا کئے رکھا۔۔۔ اس امر سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ ان (حضرات) کی خطابت نے مجموعی طور پر مسلمانوں کو بعید نقصان پہنچایا اگر یہ حضرات صاحب ایمان ہوتے اور مسلمانوں کے سواد اعظم سے وابستہ ہوتے تو ہندوستان کی تقسیم مسلمانوں کے حق میں بہت بہتر صورت میں عمل میں آسکتی تھی۔ ہندو کانگرس اور گاندھی جی درجۂ نوآبادیات سے آگے ہرگز بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو انگریز کی توپوں کے سایہ میں "رام راجیہ" قائم کرنے کے متمنی تھے اور دوسری طرف وہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کو برطانوی سامراج ایجنٹ قرار دیتے تھے، حالانکہ مسلم لیگ مکمل آزادی کی علمبردار تھی اور آزادی کے بعد انگریز سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہتی تھی، ہندو کانگریس کے نقارچی علماء دن رات قائد اعظم علیہ الرحمۃ کو برطانوی سامراج کا ایجنٹ ثابت کرنے میں لگے رہتے تھے اور ان نام نہاد علماء نے صرف قائد اعظم کی ذات کو ہی تضحیک کا نشانہ بنایا ہوا تھا کیونکہ قائد اعظم علیہ الرحمۃ ہی تحریک پاکستان اور مسلمانان ہند کی تمناؤں اور آرزوؤں کے محور تھے۔

اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جمعیت العلمائے ہند مجلس احرار اور یونینسٹ پارٹی کے گٹھ جوڑ نے ہمارے قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی جو ناپاک سازش مرتب کی تھی وہ خضر حیات ٹوانہ اور کانگریس کی کولیشن حکومت کی صورت میں منظر عام پر آگئی اور ان دشمنان اسلام نے پنجاب کے مسلم اکثریتی صوبہ میں پاکستان کے مخالفین کا تسلط قائم کر دیا اور ابوالکلام آزاد بہ نفسِ نفیس اس کام کی تکمیل کے لئے لاہور میں عرصہ دراز مقیم رہے تاکہ پاکستان کے حصول کے مقصد کو ضرب کاری لگائی جا سکے اس شرمناک فعل میں عطاء اللہ شاہ بخاری کی شخصیت منفرد ہے چونکہ عوام کو گمراہی کے راستے

پر ڈالنے کے لئے ان کی خطابت سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ ان کے پُرفریب نام نہاد درویشی بہروپ کو بھی بھولے بھالے عوام کے لئے دام ہمرنگ بچھانے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان کا لقب "امیر شریعت" تھا اور وہ شریعت کی حکومت نافذ کرنا چاہتے تھے احمقوں کے گروہ میں سے ان کو یہ کوئی نہ پوچھ سکا کہ حضرت آپ مطالبہ پاکستان اور دو قومی نظریہ کی مخالفت تو کرتے ہیں کیا آپ گاندھی، نہرو اور پٹیل کی وساطت سے متحدہ ہندوستان میں شریعت کی حکومت نافذ کرانا چاہتے تھے اور کیا اسلام کا بول بالا کرنے کا یہی طریقہ ہے"[1]

دیکھا آپ نے اکھنڈ بھارت کے نعرے لگانے والے کون تھے اور قیام پاکستان میں قائد اعظم کی مخالفت کن لوگوں نے کی۔ ہم دانشورانِ ملت کی خصوصی توجہ اس جانب مبذول کروانا ضروری تصور کرتے ہیں کہ تعلیمی نصاب میں مخالفین تحریک قیام پاکستان کی حوصلہ افزائی کیوں ہو رہی ہے اور دیوبند اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریکوں کے مقابلے کیوں کروائے جا رہے ہیں جب کہ "علی گڑھ" ایک قومی و ملی ادارۂ تعلیم اور "دیوبند" نجدی فرقہ کے مخصوص مذہبی ادارے کا نام ہے۔

زیر نظر مقالہ جناب علامہ سید محمد فاروق القادری ایم اے نے تحقیق انیق کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور قارئین کے لئے مختصر اور جامع مواد جمع فرمایا ہے جو تحریک قیام پاکستان میں کانگریسی دیوبندیوں کے کردار پر ایک سیر حاصل بحث کرتا ہے، آج یہ لوگ اپنی بے وفائیوں پر پردہ ڈال کر وفاداری کا دعویٰ کر رہے ہیں مگر تاریخ تو اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہے اس لئے اب ہم جناب علامہ موصوف کی نشاندہی پر ملک و ملت سے کھوکھلی وفاداریاں جتلانے والوں کے متعلق

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۶ اگست ۱۹۷۱ء

یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

اس سے پہلے یہ مقالہ کتاب " اکابر تحریک پاکستان " مصنفہ جناب محمد صادق قصوری شائع کردہ مکتبہ رضویہ گجرات میں مقدمہ کی حیثیت سے منظر عام پر آچکا ہے اور اہل علم میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔

خادم اہلسنّت
(شیخ) دوست محمد قاسمی نقشبندی
سیکرٹری جنرل - انجمن غوثیہ اہل سنت وجماعت
تربیلا ڈیم پراجیکٹ
یکم رجب المرجب ۱۳۹۶ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

مقدّمہ

از سیّد محمّد فاروق القادری ایم۔ اے عربی/اسلامیات (گولڈ میڈلسٹ)

جب سے برّصغیر پر فرنگی اقتدار نے پنجے جمائے ٹھیک اسی وقت سے آزادئ وطن کے مشن کا بھی آغاز ہوا۔ یہ آغاز کن لوگوں نے کیا؟ اس پر کما حقّہ روشنی ڈالنے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ انگریزی سامراج کی نوآبادیاتی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ ادھر اس نے ایک خطّے پر قبضہ جمانے کو قدم رکھا اور ادھر اس قطعۂ ارض کا حسّاس سینہ کرب سے چیخ اُٹھا۔ یہی وہ پہلی چیخ تھی جسے بلاشبہ جنگِ آزادی کا پہلا غلغلہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ آواز کس طبقے نے بلند کی؟ اس کا جواب پوری تاریخ میں ایک ہی ہے، علماء اور مشائخ!

آج ہماری آزادی کی تاریخ جس انداز سے مرتب ہو کر سامنے آرہی ہے اس میں قلم کا تعصّب پورے طور پر سرایت کیے ہوئے ہے۔ تحریکِ آزادی محض ایک وقتی و ہنگامی جذبہ نہ تھا بلکہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے ایک منظم پروگرام کی بنیاد تھی جس نے آگے چل کر پاکستان کا روپ دھارا۔ اس پوری تحریک کا مطالعہ کرنے سے ہمارے سامنے دو قسم کے لوگ آتے ہیں، ایک تو وہ جن کا مقصد صرف انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنا تھا، اس کے بعد سیکولر اسٹیٹ بنے یا عملاً ہندو سامراج اس کی جگہ لے لے، انہیں اس سے کچھ غرض نہ تھی، دوسرے وہ جو عملی طور پر دوبارہ برّصغیر میں مسلمانوں کا اقتدار بحال کر کے یا ایک علیحدہ خطّۂ زمین حاصل کر کے قرآنی نظامِ حیات

پر مشتمل ایک اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ دوسرے مقصد کے مقابلے میں پہلا مقصد ذرا بھی مقدس نہیں۔ آج ہم جب پورے حالات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ افسوسناک تاریخی مغالطہ ایک حقیقت کا روپ دھارتا جا رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اصل عظمت و کردار کا مستحق پہلا گروہ ہے اور اگر ملّی تاریخ میں کچھ خدمات ہیں تو بس اسی کی!

تحریکِ پاکستان کی بنیاد ۱۸۵۷ء میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا کافی مرادآبادی شہید، سیّد احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا رضی الدین بدایونی ایسے مجاہدینِ آزادی اور سرفروشانِ اسلام اپنا خونِ جگر دے کر پھانسی کے تختوں پر چڑھ کر اور کالے پانی کی تکالیف برداشت کرکے رکھ چکے تھے۔ مجاہدین کا یہ گروہ اسی سوادِ اعظم سے تعلق رکھتا ہے جسے آج بھی قال اقولی قسم کے مُلّا حضرات جذبۂ حبِّ نبوی میں غلو کا الزام دیتے ہیں۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ برِصغیر میں انگریزی سامراج کی بنیادیں ہلانے والوں اور اسلامی حکومت کے اولین معماروں کو تو پسِ پشت ڈال دیا گیا اور ان کے مقابلے میں بوجوہ سیّد احمد بریلوی اور شاہ محمد اسمٰعیل کو پورے برِصغیر کی مذہبی و ملّی تحریکات کا واحد ہیرو بنانے کی کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔ ایک گروہ پر تاریخ کی یہ تیز روشنی اور دوسرے کو اندھیروں میں رکھنے کے پیچھے وہ علیحدہ نظریات کا وہی جذبہ کارفرما ہے جس کے بارے میں ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ اسے حسنِ اتفاق سمجھیے یا سوءِ اتفاق کہ ایک نظریے کی تصویب و تائید کے لئے اسے علمی فضا میسّر ہو گئی جو دوسرے کو نہ ہو سکی۔ شاہ محمد اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی کی تحریک پر تبصرہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں البتہ اس تحریک کے بارے میں مولانا حسین احمد مدنی کا یہ غور طلب تجزیہ پیشِ خدمت ہے، آپ لکھتے ہیں:۔

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلّط

اور اقتدار کا قلع قمع کرنا تھا جس کے باعث ہندو مسلمان دونوں پریشان تھے اس بناء پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور صاف صاف انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پردیسی لوگوں کا اقتدار ختم کرنا ہے۔ اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اس سے آپ کو غرض نہیں، جو لوگ حکومت کے اہل ہوں گے، ہندو یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔" [1]

اس کے ساتھ ہی مولانا عبید اللہ سندھی کی یہ عینی شہادت بھی ملاحظہ فرمایئے:

"ایک دفعہ میں سرحد پار بنیر کے مقام پر گیا۔۔۔۔۔ میں اس امید میں کہ شاید سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی جماعتِ مجاہدین میں زندگی کی کوئی کرن دکھائی دے ادھر چل دیا۔ وہاں پہنچ کر جو کچھ میں نے دیکھا وہ حد درجہ افسوسناک تھا اور قابلِ رحم تھا وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ جماعت جو مجاہدین کے نامِ نامی سے یاد کی جاتی ہے کس بری حالت میں ہے اور اس کی گزران اور اس کی زندگی کس طرح صاحبزادہ عبدالقیوم خاں کی وساطت سے انگریزی حکومت کی رہینِ منّت ہے۔" [2]

دیکھا آپ نے؟ وہ تھا نظریہ، یہ ہے عمل۔ پورا برِصغیر فرنگی اقتدار کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ ہلال و صلیب کے حرب صرف ملک گیری ہی تک محدود نہیں بلکہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی گستاخیوں سے بڑھ کر مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے استعمال ہو رہے ہیں، سوادِ اعظم کے علماء و فقراء پر قیامت گزر گئی ہے۔ قال اللہ و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نغمات

---

[1] نقشِ حیات: ج ۲: ص ۱۳۔

[2] افادات و ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی، از محمد سرور: ص ۳۶۲

الاپنے والے پھانسی کے پھندوں، جیل کی کوٹھڑیوں اور کالے پانی کو آباد کئے ہوئے ہیں مگر مجاہد فی سبیل اللہ اور شہیدِ اسلام اس سارے معرکے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے فرنگی اقتدار کے قابو میں نہ آنے والے آزاد قبائل کے ساتھ رفع یدین اور نکاحِ بیوگان کے مسئلے پر جہاد کر رہے ہیں یا پھر ایک غیر سیاسی قوت سکھوں کے ساتھ لڑائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

قیامِ پاکستان کے اسباب

دو مختلف نقطہ ہائے نظر کا یہی وہ اختلاف ہے جو آگے چل کر تحریکِ پاکستان اور پھر قیامِ پاکستان تک بڑھ کر نقطۂ عروج کو پہنچا۔ قیامِ پاکستان کے اسباب کے سلسلے میں پہلے مختصر طور پر ہندو ذہنیت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

بلاشبہ آزادی کی تحریک اکٹھے شروع ہوئی مگر جلد ہی ہندو طرزِ عمل نے ثابت کر دیا کہ یہ محض اقتدار کی تبدیلی ہوگی اور ہندو اقتدار کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ثابت ہوگا اس لئے دردمند مسلمانوں نے جلد ہی اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ مسلمان اپنے مذہب کی بناء پر ایک الگ قوم ہیں اور وہ اپنے دین کے مطابق اسی صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جب ان کی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قانونِ الٰہی نافذ کر سکیں۔ یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کے محرکات جاننے کے لئے ذیل کے حوالہ جات ملاحظہ کیجئے۔

ڈاکٹر رادھا مکرجی نائب صدر ہندو مہاسبھا و صدر کانگریس بنگال نے کہا:

"ہندوستان کو نظریہ اور عمل کے لحاظ سے ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہئے جس کا کلچر ہندو جس کا مذہب ہندو ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو" [1]

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۳۸ء

کانگریس کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی نے اگست ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک بیان میں کہا:

"گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہلِ ملک کے ہاتھ میں دے دیں بلکہ یہ سب سے ضروری چیز ہے کہ ہم اپنی تمام جد و جہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفہ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو، بالفاظِ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے الخ" [1]

مہاتما گاندھی نے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۴ء کو قائدِ اعظم کے نام ایک خط میں لکھا:

"میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباء و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کرے کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے الگ ایک قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم رہنا چاہئے خواہ اس کے سپوتوں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو" [2]

گئو رکھشا کے بارے میں انہوں نے ۱۹۱۸ء میں کہا:

"یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ یورپین کے لئے گاؤ کشی جاری رکھنے کی بابت ہندو کچھ بھی محسوس نہیں کرتے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کا غصہ اس خوف کے نیچے دب رہا ہے جو انگریز عملداری نے پیدا کر دیا ہے

[1] طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۶۹ء۔

[2] ایضاً

مگر ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول و عرض میں ایسا نہیں جو اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو ہندو مت ۔ عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے سے تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤکشی بند کر دیں ۔" [1]

دوسرے مقام پر گاندھی جی یوں گویا ہوتے ہیں :

" میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں ، اپنشدوں ، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں ، اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ کے عقیدہ پر یقین رکھتا ہوں ، میں گئو رکھشا کو اپنے مذہب کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا ، میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے ۔" [2]

اب مذہب کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی سنیئے :

" جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے ۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے ۔ قریب قریب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا بے دلیل عقیدت اور تعصب کا توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا قائم شدہ حقوق اور مستقل حقوق کی بقار کا حامی ہے ۔" [3]

---

[1] طلوعِ اسلام ، مارچ ۱۹۶۹ء

[2] ینگ انڈیا ۲۱/۱۰/۱۲ ، بحوالہ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۶۹ء

[3] طلوعِ اسلام ، جون ۱۹۳۸ء

ہندو دھرم کی یہی وہ قدیم منافقانہ پالیسی تھی کہ اپنے دھرم پر آنچ نہ آئے ، دوسروں کی بات آئے تو سیکولر حکومت کی باتیں کرنے لگو جس سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے فرمایا ؎

نگہ دارد برہمن کارِ خود را　　نمی گوید بہ کس اسرارِ خود را

بہ من گوید کہ از تسبیح بگذر　　بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

یہ وہ حالات تھے جنہیں دیکھ کر حسّاس مسلمانوں کے دل کانپ اُٹھے اور انہوں نے بروقت متنبہ کیا کہ ہندو اپنی عیّاری اور دو رُخی پالیسی کے لحاظ سے انگریز سے کہیں زیادہ خطرناک ہے ۔ سوادِ اعظم کے عظیم روحانی پیشوا مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے بروقت خبردار کرتے ہوئے فرمایا :

" تم نے دیکھا یہ حالت ہے ان لیڈر بننے والوں کے دین کی ، کیا کیا شریعت کو مسلتے ، بدلتے ، پاؤں کے نیچے کچلتے اور خیر خواہِ اسلام بن کر مسلمانوں کو چھلتے ہیں ، موالاۃِ مشرکین ایک ، معاہدۂ مشرکین دو ، استعانت بمشرکین تین ، مسجد میں اعلائے مشرکین چار ، ان سب میں بلا مبالغہ یقیناً قطعاً لیڈروں نے خنزیر کو دنبے کی کھال پہنا کر حلال کیا ہے ۔" [1]

ہندو ذہنیت کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہی فاضل بریلوی نے ترکِ موالات کا وہ مشہور فتویٰ لکھا جسے سہارا بنا کر یار لوگوں نے آپ کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی حالانکہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جس وقت فاضل بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو آپ نے صاف فرمایا :

" مولانا ! میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے ۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں ، میں مخالف ہوں ۔" پھر فرمایا " مولانا ! میں

---

[1] المحجۃ المؤتمنہ : ص ۸۶ ، ۸۷ ۔

ملکی آزادی کا مخالف نہیں، ہندو مسلم اتحاد کا مخالف ہوں۔" [1]

کانگریسی علماء کی ذہنیت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ جس نے انہیں ہندوؤں کے چرنوں میں سجدہ ریزی سے روکا انہوں نے اپنے بیگانے کی تمیز کئے بغیر فوراً اس پر انگریز دوستی اور وطن دشمنی کا فتوے جڑ دیا۔ فاضل بریلوی اور تمام مسلم لیگی زعماء تو مجرم سمجھے ہی، اتفاق سے پورے دیوبند میں صرف ایک عالم مولانا اشرف علی تھانوی نے ان سے اختلاف کیا تو ان کو جو صلواتیں سننا پڑیں ان کی جھلک آپ بھی دیکھ لیجئے۔

پروفیسر محمد سرور کا بیان ہے :

" مولانا سندھی، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے علم و فضل اور ارشاد و سلوک میں انہیں جو بلند مقام حاصل تھا اس کے تو قائل تھے لیکن تحریک آزادئ ہند کے بارے میں ان کی جو معاندانہ اور انگریزی حکومت کے حق میں مؤیدانہ روش رہی اس سے وہ بہت خفا تھے۔" [2]

پاکستان اور علمائے دیوبند

دو قومی نظریئے کی کہانی بہت پرانی ہے۔ برصغیر کے اکثر مسلمان مفکرین مسلمانوں کے علیحدہ ملی تشخص اور سرزمین حجاز سے اس کی وابستگی پر ہمیشہ زور دیتے رہے ہیں۔ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی [3] اور فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں [4] (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے پورے شد و مد سے اس کی وضاحت کی ہے۔ ہم یہاں پر مکتب دیوبند کے علماء سے یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ

---

[1] فاضل بریلوی اور ترک موالات، پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۴۵

[2] افادات و ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی، ص ۳۸۲

[3] تذکرہ شاہ ولی اللہ، مناظر احسن گیلانی۔

[4] فاضل بریلوی اور ترک موالات، پروفیسر محمد مسعود احمد۔

اگر وہ بقول خود شاہ ولی اللہ کی تحریک کے وارث اور جانشین ہیں تو پھر ان کے دینی و ملی نظریات پر کامل طور پر یقین نہ رکھنے کا سبب کیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی نگاہ میں دین صرف سجود و قیام کا نام ہے اور کسی اسلامی ریاست کے لئے بنیادی نظریات فراہم کرنے کے سلسلے میں وہ دین اسلام کے مفکرین سے مدد لینے کے بجائے اپنے خود ساختہ اور دور از کار ضوابط پر عمل پیرا ہیں؟ دو قومی نظریہ جس کی بنیاد کتاب و سنت اور مسلمانوں کا یہ دو سو سالہ تہذیبی ورثہ ہے اس کے مقابلے میں وطنی قومیت کا نعرہ ایک ایسا کھلا غیر اسلامی دعویٰ ہے جو گاندھی اور نہرو ایسے پُر پیچ، مفاد پرست اور عیار سیاستدانوں سے تو متوقع ہو سکتا ہے مگر صاحبان جُبّہ و دستار اور وارثان منبر و محراب کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔

افسوس مکتب دیوبند کی اکثریت نے برصغیر میں اسلامی ریاست کی امکانی حد تک مخالفت کر کے تحریک آزادی کے سلسلے میں بھی اپنے تھوڑے سے بہت کام پر لکیر پھیر کر رکھ دی ہے۔ کیا وقت کا بیدار مؤرخ یہ لکھنے میں حق بجانب نہ ہوگا کہ علمائے دیوبند کا یہ گروہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے مقابلے میں گاندھی جی کی میکیاؤلی سیاست پر زیادہ یقین رکھتا تھا اور اس نے مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کے دور میں سات کروڑ مسلم عوام کے مقابلے میں اپنا سارا وزن ہندوؤں کے پلڑے میں رکھ دیا؟

یہ تلخ حقیقت علمائے دیوبند کو برداشت کرنا پڑے گی کہ ان کے پیش نظر برصغیر میں اسلامی حکومت کا قیام کبھی بھی نہیں رہا بلکہ وہ ہمیشہ جمہوری انداز کی سیکولر حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ شاہ محمد اسمٰعیل کی تحریک ہو کہ جمعیۃ العلمائے ہند کی تنظیم، احرار ہوں یا آزاد، ان سب کا انداز فکر اس معاملے میں حیرت انگیز یکسانیت کا حامل رہا ہے۔ اسلامی حکومت کا قیام تو بہت مقدس نصب العین ہے انہوں نے تو مسلمانوں کے مفادات تک کی پرواہ نہیں کی جو احسان کا معمولی درجہ ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی ہو یا قیام پاکستان کی جدوجہد

یہ انہیں لوگوں کی رہینِ منّت اور شرمندۂ احسان ہیں جنہیں آج بھی مکتبِ دیوبند کے ذمہ دار فرد سے طفلِ مکتب تک بدعتی، قبر پجوے اور میلاد خواں کے طعنے دیتے ہیں۔ کیا پاکستان کی کوئی تاریخ "بنارس سُنّی کانفرنس" کے فقید المثال اجتماع کا ذکر کئے بغیر مکمل ہو سکتی ہے؟ صدر الافاضل سید نعیم الدین مرادآبادی، ابوالمحامد سید محمد شاہ محدث کچھوچھوی، خواجہ محمد قمر الدین سیالوی، مولانا امجد علی، خواجہ عبدالرحمٰن بھرچونڈوی، پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا پیر سید مغفور القادری، مولانا ابوالحسنات قادری، علامہ عبدالغفور ہزاروی، پیر صاحب مانکی شریف، پیر صاحب گولڑہ شریف، مولانا عبدالستار خاں نیازی، یہ عظیم شخصیتیں اور لاکھوں انسانوں کے مقتدا کون ہیں؟ وہی تو ہیں جو فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں کے ہم مسلک تھے، آج ان پر کیچڑ اچھالنے والے ذرا جائزہ تو لیں کہ پورے مکتبِ دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی یا مولانا اشرف علی تھانوی کے محدود حلقے کے دو چار آدمیوں کے سوا باقی سارے علماء عملی طور پر کہاں کھڑے تھے؟ برِصغیر کے تمام علمی مدارس اور مکاتب پر مولانا مدنی اور دیوبند کے اسی حلقے کے اثرات تھے جو نیشنلسٹ خیالات کا علمبردار اور گاندھی و نہرو کو قبلۂ سیاست سمجھے ہوئے تھا۔ مسلم لیگ کے حلقے میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی پذیرائی کی یہ شان صرف اس لئے بنی کہ وہ اپنے سارے قافلے سے تنہا کٹ کر ادھر آئے تھے، دیوبند کے علماء و طلباء نے انہیں اس کی جو سزا دی وہ خود انہیں کی زبانی سنئے:

"دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے جو گندی گالیاں اور فحش اشتہارات اور کارٹون ہمارے متعلق چھپیاں کئے جن میں ہم کو ابوجہل تک کہا گیا اور ہمارا جنازہ نکالا گیا، آپ حضرات نے اس کا بھی کوئی تدارک کیا تھا؟ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے تمام مدرسین، مہتمم اور مفتی سمیت بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے نسبتِ تلمذ رکھتے ہیں۔" [1]

---

[1] مکالمۃ الصدرین، طبع ہاشمی بک ڈپو لاہور: ص: ۳۲، ۳۳۔

مکتب دیوبند کے نامور عالم شیخ الہند مولانا محمود حسن کو کون نہیں جانتا آج اسیر مالٹا اور تحریکِ آزادی کے مجاہدین میں انہیں سرِ فہرست شمار کیا جاتا ہے برِصغیر سے انگریزی اقتدار کے خاتمے کا جو پروگرام آپ نے مرتب فرمایا اس میں کسی اسلامی حکومت کے تصور کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے واضح طور پر ایک لادینی (سیکولر) حکومت کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کو آپ ہی نے کابل بھیجا، وہاں آپ کے حکم اور مشورے سے ——— موقتہ ہند کے نام سے ایک متوازی حکومت بنائی گئی لیکن آپ حیران ہوں گے کہ اس حکومت کے لائف پریذیڈنٹ (LIFE PRESIDENT) معروف متعصب سکھ لیڈر راجہ مہندر پرتاپ مقرر ہوئے جبکہ مولانا عبیداللہ سندھی اس کے وزیرِ خارجہ تھے۔ اس سے آپ بخوبی اس حکومت کا نقشہ سمجھ سکتے ہیں جو ان حضرات کے ذہنوں میں موجود تھا۔ مزید اطمینان کے لئے مولانا سندھی اور راجہ صاحب کے رفیقِ کار ظفر حسن صاحب کا یہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیے اور ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ یہ حضرات مسلمانوں کو کہاں لے جا رہے تھے؟

ظفر حسن ایبک لکھتے ہیں:

"راجہ مہندر پرتاپ ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہاں ایک ہندو حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔" [1]

خدا لگتی کہئے کیا یہ تجزیہ اس سے کچھ مختلف ہے جو مسلم لیگی زعماء نے کانگریس کے بارے میں کیا تھا؟

مولانا عبیداللہ سندھی نے کابل سے آزادیٔ ہند کے بعد حکومت کا جو نقشہ پیش کیا اس کی یہ شق دیدنی ہے (یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مولانا سندھی شیخ الہند کے معتمد خصوصی، ان کے فرستادہ اور انہی کے مشن کی تکمیل کے لئے کابل گئے تھے) مولانا سندھی نے "جمنا نربدا سندھ ساگر

---

[1] آپ بیتی ظفر حسن ایبک، طبع منصور بک ہاؤس لاہور، ص ۱۰۰

[2] ایضاً " : ص ۹۷

پارٹی"، کانگریسی سوراجیہ کمیٹی کابل، مہابھارت سوراجیہ پارٹی اور حکومتِ موقتہ ہند کے ذمّہ دار رکن کی حیثیت سے ہر جگہ ایک ہی جملہ دہرایا ہے، فرماتے ہیں :

" مرکزی حکومتِ ہند (CENTRAL GOVT. OF THE FEDERAL REPUBLIC OF INDIA) کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ اس کو ان مذاہب میں دخل دینے کا حق حاصل ہوگا جو پارٹی کے مندرجہ بالا اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کو مانتے ہیں " [1]

اس کے مقابلے میں علّامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا :

" ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں یہ ایک نظامِ حکومت ہے ۔۔۔۔۔۔ اس لئے میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے " [2]

ہر دو نقطہ ہائے نظر آپ کے سامنے ہیں، خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ان میں سے کونسا اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ قریب ہے؟ کانگریس کے نزدیک ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلم اور غیر مسلم ایک متحدہ قومیت کے افراد تھے۔ یہی وہ فسوں ہے جس کا شکار مولانا محمود حسن سے لے کر مولانا حسین احمد اور مولانا ابوالکلام آزاد تک سب لوگ ہوئے۔ مولانا

[1] پمفلٹ جنازہ بدا سندھ ساگر پارٹی، شائع کردہ بیت الحکمۃ دہلی، مولانا سندھی، ص ۵۰،
و مولانا عبیداللہ سندھی، پروفیسر محمد سرور سندھ ساگر اکادمی، ص ۴۵۸۔

[2] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۲ء

حسین احمد نے دہلی میں ۱۹۳۸ء میں کہا کہ :

" قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں "

مولانا کے اس نظریئے پر برِّصغیر کا پورا مذہبی طبقہ چونک اٹھا۔ علامہ اقبال نے بسترِ مرگ پر سے اس نظریئے پر یوں تنقید فرمائی ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست [1]

علامہ اقبال کی زندگی میں مولانا حسین احمد خاموش ہو گئے۔ جونہی حضرتِ علّامہ اللہ کو پیارے ہوئے انہوں نے " اسلام اور متحدہ قومیت " کے نام سے پھر ایک رسالہ لکھ ڈالا اور اس میں تحدّی سے کہا کہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ ٹھیک تھا، علامہ اقبال غلط تھے۔ چنانچہ مسٹر غلام احمد پرویز نے بروقت اس رسالے کا تعاقب کیا اور غلط و صحیح کو الگ الگ کر کے دکھایا۔ پرویز صاحب نے مولانا حسین احمد کو متنبہ کیا کہ اگرچہ علّامہ مرحوم ہماری بزم سے اٹھ گئے ہیں تاہم ان کے ہم خیال اور اسلامی قومیت کے علمبردار ابھی محاسبہ کرنے کے لئے موجود ہیں۔ تعجب ہے کہ مکتبِ دیوبند میں اس مسئلے پر کس قدر حیرت انگیز یکسانی پائی جاتی ہے۔ یہ اندھی تقلید کا کرشمہ ہے یا مغالطہ، اللہ بہتر جانتا ہے۔ اس یکسانیت کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

مولانا عبیداللہ سندھی آخر دم تک اپنا یہ نظریہ ان الفاظ میں دہراتے رہے جس کے راوی آج بھی موجود ہیں :

" میں سندھی پہلے ہوں اور مسلمان بعد میں "

مولانا ابوالکلام آزاد نے لاہور میں فرمایا :

[1] ارمغانِ حجاز ، ص ۲۷۸۔

"مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے، میں اس باب میں ان سے متفق نہیں۔"[1]

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا :

"ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے، ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے خود بخود بنا کرتے ہیں اور قسمت کی مُہر اس پر لگ چکی ہے، ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں، علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔"

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :

"میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔"

ان کے علاوہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم نے پاکستان کی مخالفت میں جو کردار انجام دیا وہ نظریات کی اسی یکسانیت کا آئینہ دار ہے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد آہستہ آہستہ اس زود فراموش قوم کو بیوقوف بنانے کے لئے اب یہ مہم شروع کردی گئی ہے کہ مولانا حسین احمد نے اپنے نظریے سے رجوع کرلیا تھا یا علامہ ان کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکے تھے، یہاں تک کہ علامہ طالوت اور شورش کاشمیری ایسے پڑھے لکھے اور باخبر حضرات بھی یہی راگ الاپے جارہے ہیں۔ ان کی خدمت میں سوائے اس کے اور کیا عرض کریں کہ حقائق کا چہرہ اتنی جلدی مسخ نہیں ہوسکتا!

---

[1] STATESMAN DATED: 19.2.40، بحوالہ طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۷۳ء، روزنامہ نوائے وقت ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۵ء۔

اس سے بڑھ کر جب ان علماء نے گاندھی جی کو جامع مسجد شیخ خیر الدین امرتسر میں منبرِ رسول پر بٹھایا[1] اور اس کے ذریعے اسلام کی امداد کی دعا کی گئی اور گاندھی کی جے کے نعرے لگوائے گئے تو مسلم قومیت کے علمبردار فاضل بریلوی چیخ اُٹھے، آپ نے فرمایا :

"جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خودداری؟ وہ تمہیں ملیچھ جانیں، بھنگی مانیں، تمہارا پاک ہاتھ جس چیز کو لگ جائے گندی ہوجائے، سودا بیچیں تو دور سے ہاتھ میں ڈال دیں۔۔۔۔ حالانکہ بحکمِ قرآن خود وہی نجس ہیں اور تم نجسوں کو مقدس مُطہر بیت اللہ میں لے جاؤ، جو تمہارے ماتھا رکھنے کی جگہ ہے وہاں ان کے گندے پاؤں رکھواؤ، مگر تم کو اسلامی حِس ہی نہ رہا، محبتِ مشرکین نے اندھا بہرا کردیا، ان باتوں کا ان سے کیا کہنا جن پر "حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ" کا رنگ بھر گیا، سب جانے دو، خدا کو منہ دکھانا ہے یا ہمیشہ مشرکین ہی کی چھاؤں میں رہنا ہے، جواز تھا تو یوں کہ کوئی کافر ۔۔۔۔۔۔ مثلاً اسلام لانے یا اسلامی تبلیغ سننے یا اسلامی حکم لینے کے لئے مسجد میں آئے یا اس کی اجازت تھی کہ خود مشرکوں نجس بت پرستوں کو مسلمانوں کا واعظ بنا کر مسجدوں میں لے جاؤ، اسے مسندِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بٹھاؤ۔۔۔۔۔۔ کیا اس کے جواز کی کوئی حدیث یا کوئی فقہی روایت تمہیں مل سکتی ہے؟ حاشا ثم حاشا للہ انصاف! کیا یہ اللہ و رسول سے آگے بڑھنا، شرعِ مطہر پر افتراء گھڑنا احکام الٰہی دانستہ بدلنا سؤر کو بکری بنا کر نگلنا نہ ہوگا۔"[2]

---

[1] مقالاتِ یومِ رضا، مضمون فاضل بریلوی کے رفقاء کی سیاسی بصیرت، از حکیم محمد موسیٰ امرتسری۔

[2] المحجۃ المؤتمنہ : ص : ۸۴

نظریات کا یہی وہ اختلاف ہے جس میں اعتقادی مباحث کی طرح سوادِ اعظم کی اکثریت سیاسی پلیٹ فارم پر بھی مکتبِ دیوبند سے الگ ہو گئی۔ انگریزی سامراج سے نجات حاصل کرنے کی تحریک یقیناً ایک عظیم تحریک تھی لیکن اگر یہ تحریک صرف وطنی بنیادوں پر اُٹھے تو آخر اس کا موازنہ اس تحریک سے کیسے کیا جا سکتا ہے جس کا مطمح نظر کتاب و سنت کے مطابق ایک اسلامی ریاست قائم کرنا ہو۔ وطنی بنیادوں پر تو کتنے ہی مسلمان لیڈروں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں مثلاً مصطفٰے کمال پاشا، خوشحال خان خٹک، پیر سید صبغۃ اللہ شاہ پیر پاگارا شہید کے نام اسی ضمن میں آتے ہیں لیکن آج کسی میں اتنی جرأت ہے کہ وہ ان کی مساعی اور کوششوں کو اسلامی جہاد یا کسی نوعیت سے اسلامی خدمت قرار دے سکے؟ اگر نہیں ہے تو کس برتے پر مکتبِ دیوبند کے علماء اور شورش کاشمیری ایسے صحافی جن سے تحریکِ پاکستان اور آزادی کا کوئی گوشہ مخفی نہیں پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا ابوالحسنات قادری اور اسی قبیل کے دوسرے لوگوں کا ذکر قدح کے بغیر نہیں کرتے۔

فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں کے ہم مکتب علماء و مشائخ کا یہی وہ با اثر گروہ ہے جس نے دامے، درمے، سخنے، قدمے پاکستان کے لئے کام کیا، لاکھوں روپے چندے دئے، دن رات کا آرام حرام کیا، برِصغیر کے کونے کونے میں پہنچ کر رائے عامہ کو ہموار کیا، ہر قسم کی تکالیف برداشت کیں۔

سرحد میں پیر مانکی شریف، پنجاب میں پیر جماعت علی شاہ علی پوری اور سندھ میں پیر عبدالرحمٰن بھرچونڈوی اور شاہ مغفور القادری نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں اسے مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ قدآور شخصیتیں اور بلند ہستیاں اسی لئے طاقِ نسیاں کی نذر کی جا رہی ہیں کہ قلم غیروں کے ہاتھ میں ہے یا اس ملک میں مسلم لیگ کا وجود ختم کر دیا گیا ہے؟

یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص شیخ الاسلام کے لقب سے ملقّب ہو یا کوئی شیخ الہند کے

منصب پر فائز! سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ملّی تشخص اور اسلام کے احیاء کے لئے کس نے کتنا کام کیا ہے؟ ہمیں کسی سے ذاتی پرخاش نہیں ہے، یہ تاریخی حقائق ہیں جو سامنے آ کر رہیں گے، ان میں خیانت کرنے والے تاریخ کے طالب علموں کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

آج کا مؤرّخ اور قاری دونوں بیدار ہیں۔ وہ سلطانی و ملوکی دَور لَد گئے جب مؤرّخ شاہوں کے بارے میں دیو مالائی قسم کی کہانیاں لکھ کر انہیں خوش کر دیتے اور قارئین اسے افیون سمجھ کر لطف اندوز ہوتے رہتے، اب ہر بات پر غور ہوتا ہے، ہر بیان کو عقل و نقل کے مصدّقہ اصولوں پر پرکھا جاتا ہے، اسلام پر ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں ہے، کھوٹا مال بھی ہر جنس میں موجود ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک آدھ آدمی کا سہارا لے کر سوادِ اعظم کی تضحیک کی جائے، فکر و نظر اور اعتقادیات کے اختلافات سدا ہوتے آئے ہیں انہیں وجہ بنا کر تاریخی بددیانتی صرف وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں قلم کی عظمت اور عصمت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

اس کے ساتھ ہی میں سوادِ اعظم کے پڑھے لکھے اور محبِّ وطن طبقے سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ اگر مُردنی اور بے حسی نے پوری طرح ان پر قابو نہیں پا لیا تو وہ آگے بڑھیں اور ۱۸۵۷ء سے لے کر قیامِ پاکستان کی تاریخ تک اپنے اسلاف کے قابلِ فخر اور زرّیں کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرائیں۔ اگر انہوں نے اس فرض کی ادائیگی میں غفلت برتی تو وہ وقت دور نہیں جب پاکستان کے نعرے کو ایک وقتی ہنگامی جذبہ اور اس کے لئے قربانیاں پیش کرنے والے علماء و مشائخ کو انگریز دوستی کا لباس پہنا دیا جائے گا جیسا کہ گذشتہ پچیس برس سے یہ عمل جاری ہے۔

پاکستان کے حقیقی خیر خواہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ آج جبکہ پاکستان کی نظریاتی سرحدیں خطرے میں ہیں چاروں طرف سے وطنیت کا عفریت پھنکار رہا ہے ضرورت ہے کہ سوادِ اعظم کے وہی پیشوا رہنمائی کریں جنہوں نے

اس فسوں کو توڑ کر یہ ملک حاصل کیا تھا۔ اس وقت حجرہ نشینی اور وقت کی آواز سے اغماض ایک ایسا ملّی و مذہبی جرم ہوگا جس کا خمیازہ مدتوں مسلمان قوم برداشت کرتی رہے گی۔

عزیزم محمد صادق قصوری صاحب قابلِ صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے "اکابرِ تحریکِ پاکستان" لکھ کر مجاہدینِ پاکستان کے حالات کی تفصیل کا ایک خوبصورت اور قابلِ قدر اجمال ہدیۂ ناظرین کیا ہے۔ انہوں نے جن سرفروشانِ اسلام کے حالات سپردِ قلم کئے ہیں، ان میں سے ہر ایک اس قابل ہے کہ اس کی خدمات پر مستقل کام کیا جائے۔

زیرِ نظر کتاب سوادِ اعظم کے اہلِ قلم کے لئے ایک دعوت ہے کہ وہ اس سلسلے کو اس کی تمام تم تفصیلات کے ساتھ آگے بڑھائیں، اس میں تمام شخصیات سے متعلق ضروری معلومات اور ان کی خدمات کا اجمالی تذکرہ بڑے اچھے انداز میں آگیا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب ایک ماخذ کا کام دے گی۔

یوں بھی اس کی قدر و قیمت کچھ کم نہیں کہ یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے گویا اس کے ذریعہ تاریخِ پاکستان کے ایک اہم پہلو کا آغاز ہو رہا ہے۔

یہ تذکرہ پاکستان کی تاریخ کے ان کونوں کی نقاب کشائی کی طرف ایک قدم ہے جو آج تک زیادہ تر دانستہ اور باقی غیر دانستہ طور پر مخفی رکھے گئے ہیں۔

اس کے جواں سال مؤلف اگرچہ میدانِ تحریر میں نووارد ہیں تاہم یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس محنت اور لگن سے وہ تاریخِ پاکستان کے سلسلے میں تحقیقی کام کر رہے ہیں اس کی بنا پر وہ دن دور نہیں کہ سوادِ اعظم کا یہ اہلِ قلم مستقبل کا ایک منجھا ہوا مؤرّخ بن کر اُبھرے۔

خداوندِ قدوس ان کی محنت بار آور فرمائے اور ملّتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کو پاکستان

اور نظریۂ پاکستان کے بارے میں انہی جیسا جذبہ عطا فرمائے ؏
این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

سیّد محمّد فاروق القادری ایم اے
آستانہ شاہ آباد شریف
گڑھی اختیار خاں (رحیم یار خاں)

۴ رجب المرجب ۱۳۹۵ھ

کتاب

"اکابر تحریکِ پاکستان"

پر

دنیائے علم وادب اور تحقیق کی نامور شخصیات کا گراں قدر اور بےلاگ

تبصرہ

ڈاکٹر وحید قریشی ایم۔اے، ڈی لٹ

محمد صادق قصوری صاحب کی یہ کتاب "تحریکِ پاکستان" کے ایک ایسے گوشے سے تعلق رکھتی ہے جسے عام طور پر نظرانداز کیا گیا ہے۔ حلقہ علماء میں اگر کبھی تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں ذکر آیا بھی ہے تو مولانا ظفر علی خاں، مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام نامی کے سوا کچھ یوں تاثر دیا جاتا ہے گویا علماء دین کا اس تحریک سے کچھ زیادہ واسطہ نہ تھا۔ نیشنلسٹ علماء کا محور کانگرس کی امداد و اعانت تھا۔ اس سے یہ خیال عام ہوتا گیا کہ علماء نے من حیث الجماعت پاکستان کی کبھی تائید نہیں کی۔ حالانکہ تحریکِ پاکستان میں جہاں تعلیم یافتہ طبقے نے حصولِ پاکستان کے لئے قربانیاں دیں وہاں اس آواز کو مسلمانانِ برصغیر کے دلوں میں جاگزیں کرنے کا سہرا ان دینی رہنماؤں کے سر ہے جنہوں نے شہر شہر

قریہ قریہ مسلم لیگ کے پیغام کو پہنچایا اور مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ الگ مملکت کا مطالبہ دراصل ان کے دلوں کی آواز ہے۔

دیوبند کے مقابلے میں علماء کی یہ آواز بہت زیادہ موثر اور دوررس نتائج کی حامل رہی ہیں۔ زیرِنظر کتاب اسی احساس کا ایک عملی ثبوت ہے۔ اس میں ان علمائے دین کے حالات بیان ہوئے ہیں جنہوں نے جدوجہد حصول پاکستان کے لئے قید و بند کے صدمے بھی اٹھائے اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے حکومت وقت کی مخالفت کی پرواہ بھی نہیں کی۔ مولانا آزاد سبحانی، مولانا ابوالحسنات قادری، پیر ابن الحسنات، پیر جماعت علی شاہ، حکیم شمس الاسلام صدیقی، مولانا ظہور الحسن صدیقی، شاہ عارف اللہ میرٹھی، مولانا عبدالحامد بدایونی کی خدمات کا اعتراف غالباً پہلی دفعہ اسی کتاب کے ذریعے ہوا ہے۔ ان علمائے دین نے حصول پاکستان کے لئے جو خدمات انجام دیں ان کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ فاضل مورخ نے اس داستان کی مختلف کڑیاں یکجا کرنے کے لئے جن کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا اور اخبارات و کتب کے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کے بعد یہ اڑھائی سو صفحات مرتب کئے ہیں۔ اس سے ان کی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اکابر تحریک پاکستان اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے، اس میں بعض غلطیاں بھی ہیں اور کہیں کہیں واقعات کی تعبیر میں مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے تاہم مجموعی اعتبار سے قابل قدر کوشش ہے۔ امید ہے نقش ثانی میں مصنف کتابت و طباعت کے اغلاط کے علاوہ بعض مقامات پر سنین و واقعات کی غلطیوں کی تصحیح کر کے اسے زیادہ مفید اور کارآمد بنائیں گے۔

موجودہ حالت میں بھی پاکستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے قارئین اور مورخین پاکستان کے لئے یہ کتاب ایک اہم دستاویز ہے۔

ڈاکٹر محمد باقر ——— پروفیسر ایمیریٹس پنجاب یونیورسٹی

اپنی اور دوسروں کی تاریخ مرتب کرنا مسلمانوں کا شیوہ رہا ہے۔ ہندوستان میں ہندو شاہیہ کی تاریخ کے منابع صرف مسلمان مورخوں کے آثار ہیں۔ لیکن تاسیس پاکستان کے بعد انگریزوں کے زمانے کا دیا ہوا تساہل اس طرح کارفرما ہے کہ ہم ربع صدی گزرنے کے بعد ابھی تک تحریک پاکستان کے تار و پود کے اذکار کو اپنی تاریخ مرتب کرنے کیلئے جمع ہی نہیں کر سکے نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان پر لکھی جانے والی سو کتابوں میں سے تقریباً ۷۵ غیر مسلموں اور غیر ملکیوں کی ہیں اور ان لوگوں نے عمداً یا سوجھ بوجھ کی کمی کی وجہ سے ہماری تاریخ میں اس قدر گھپلا کیا ہے کہ آج وہ نسل اپنے ذہن میں پاکستان کی صحیح واضح اور روشن تصویر ہی نہیں بنا سکی جس نے اس سرزمین پر ——— پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ ——— کے نعرے لگتے ہوئے اپنے کانوں سے نہیں سنے۔ ان لوگوں کے اذہان اُن کئی قسموں کے اِزموں کی چکا چوند سے متاثر ہو رہے ہیں جن کی نشر و اشاعت وسیع پیمانے پر ہمارے اپنے ذرائع ابلاغ عزائم مشئومہ کے ساتھ کر رہے ہیں۔

ایسے میں "اکابر تحریک پاکستان" (کہ یہی اس کتاب کا نام ہے) پر نیک نیتی سے کسی ادارے کا کام کرنے کی ٹھان لینا بڑا ہی مبارک اقدام ہے۔ کیونکہ یہی وہ نقوش ہیں جن کو اجاگر کرنے سے ہم حال اور استقبال کی نسلوں کے ذہن سے وہ جالے اتار سکیں گے جو تاریخ سے ہمارے تساہل برتنے کی وجہ سے پھیلتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ مکتبہ رضویہ گجرات نے اِن اکابر پر پہلی جلد شائع کر کے ملک و ملت پر بڑا احسان کیا ہے۔ جن علمائے کرام کا ذکر اس مختصر سی کتاب میں آیا ہے اُن میں سے بیشتر ابھی زندہ ہیں اور اُن کے افکار و اعمال نمونے کے طور پر ہمارے سامنے ہیں جن سے ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے مقاصد کیا تھے۔ اس وقت کچھ لوگ اس کوشش میں ہیں کہ ہم اپنے اسلامی ماضی اور اسلامی روایات بالخصوص اسلامی فکر کو فراموش کر [illegible] واضح

طور پر ایک اِزم کے حامی نے کہا: اس بات کو بھول جائیے کہ پاکستان کیوں اور کیسے بنا تھا سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ میرے اِزم کی پیروی کر کے اسے آئندہ کیسے چلایا جا سکتا ہے۔ میں نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ آپ مجھے یہ فراموش کرنے کی تلقین فرما رہے ہیں کہ میرے آباؤ اجداد نے خدا کے احکامات اور رسول کے ارشادات کو کیوں اور کیسے قبول کیا۔ میری اور میری آئندہ نسلوں کی دنیوی اور اُخروی فلاح و بہبود صرف ایک بات سے متعلق ہے اور وہ ہے اوامر و نواہی کی پابندی اور پاکستان کا استحکام اور سلامتی بھی صرف اسی ایک بات سے متعلق ہے۔ اس اِزم کے شیدائی نے فوراً پلٹ کر کہا: معاف کیجئے مجھے اسلام اور قرآن کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور مجھے کہنا پڑا: پھر آپ سے پاکستان کی بات بھی نہیں ہو سکتی۔

سو عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ تحریک پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور اس کی صحیح جڑیں تلاش کرنے کے لئے آپ کو اُن اکابر کے احوال و آثار اور آراء و افکار کا مطالعہ کرنا پڑے گا جنہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا کر اس مملکت کی تاسیس کی اور یہی کوشش کرتے کرتے یا احکم الحاکمین کے حضور جا کر پیش ہو گئے یا ابھی تک اس دنیا میں قید و بند کی اذیتیں برداشت کر رہے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی معنوں میں اکابر تحریک ہیں اور ان کی زندگیاں ہمارے لئے عظیم مشاعل راہ ہیں۔

یہ درویش مکتبہ رضویہ گجرات کو ایسی عمدہ کتاب شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہے اور ان سے استدعا کرتا ہے کہ وہ اس سلسلے کو جاری رکھ کر بقیہ جلدیں بھی جلد شائع کریں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ آمین

نوٹ: تحریک پاکستان میں علماء و مشائخ اہل سنت کی خدمات جلیلہ سے متعارف ہونے کے لئے اکابر تحریک پاکستان (حصہ اول) قیمت ۱۵/۷۵ روپے کا مطالعہ کیجئے۔

ملنے کا پتہ: (۱) مکتبہ رضویہ [illegible] روڈ گجرات۔ (۲) شرکت اسلامیہ گنج بخش روڈ لاہور

چشمہ ابل رہا ہے محمد کے نور کا

سرزمین ہزارہ میں اوّلین مکمل اسلامی درسگاہ

دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ رجسٹرڈ ہری پور ہزارہ

خواجہ خواجگان غوث الزمان شیخ المشائخ خواجہ محمد عبدالرحمٰن صاحب چھوہروی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی زندہ کرامت جاری و ساری چشمۂ فیض ہے جسکی بنیاد آپ نے ۱۹۰۲ء میں رکھی! بانی دارالعلوم ۱۸۳۶ء میں چھوہر شریف نزد ہری پور ہزارہ میں منصۂ شہود پر جلوہ فرما ہوئے آپکا سلسلہ نسب سیدنا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے ملتا ہے آپ مادر زاد امّی تھے کسی استاد کے رہین منت نہ تھے مگر دربار رسالت سے علوم لدنیہ کی ایسی عطا و کرم نوازی تھی کہ تیس پارے الحزب المقبول یعنی مجموعہ صلوات الرسول آپکی زندہ کرامت و یادگار ہے، آپ کی پوری زندگی اسوہ حسنہ کا نمونہ اور اتباع رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا آئینہ تھی وصال سے تین ماہ پہلے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا تھا یکم ذوالحجہ ۱۹۲۳ء کو بوقت عشاء اسی ریاضت کی حالت میں محبوب حقیقی سے جا ملے، آپکا جاری کردہ چشمۂ فیض پاک و ہند کی اسلامی درسگاہوں میں ممتاز و اعلیٰ روایات کا امین ہے اور باحسن وجوہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی دینی و مذہبی ذمہ داریاں سرانجام دیتا رہا ہے۔ علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت قرآن و سنت کی تبلیغ و ترویج، نظام مصطفیٰ کا نفاذ و مقام مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا تحفظ دارالعلوم کے اولین فرائض میں سے ہے! دارالعلوم سے فارغ التحصیل و مستند علماء کرام بیرون ملک و اندرونِ ملک مدارس، مساجد، ہائی سکولز وغیرہ میں دینی و مذہبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، دارالعلوم کی مستند معلّمات صوبہ سرحد کے بے شمار سکولوں اور ہائی سکولوں میں دینیات و عربی کی تعلیم دے رہی ہیں۔

لہذا آپ سے التماس ہے کہ آپ دامے درمے سخنے قلمے ہر طرح خصوصاً زکوٰۃ، خیرات، صدقات، عشر، فطرانہ، چرم قربانی و عطیات و ماہانہ چندہ سے بھرپور تعاون فرمائیں تاکہ دارالعلوم کو اپنے مقاصد حسنہ کی تکمیل میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

آپ کا مخلص (صاحبزادہ) **محمد طیب الرحمٰن چھوہروی**

(وفاق پرنٹنگ پریس لاہور) جنرل سیکریٹری دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ رجسٹرڈ ہری پور ہزارہ